مشرقی ممالک میں اشتراکیت

—— عبد الحمید صدیقی ——

مغربی ممالک میں جب صنعتی انقلاب برپا ہو رہا تھا تو اس کے نمودار ہونے کے ساتھ ہی اہلِ مغرب نے مشرقی ممالک کی طرف حریصانہ نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا کیونکہ زود پیداواری اور کثیر پیداواری کے لیے یہ ناگزیر تھا کہ دنیا کے مختلف گوشوں میں ایسی منڈیاں تلاش کی جائیں جہاں سے انہیں بھاری مقدار میں نہایت سستے داموں خام مال فراہم ہو سکے اور جہاں وہ اسی مال کی مصنوعات کو لوٹا کر بہت زیادہ قیمت وصول کر سکیں۔ اپنے اس مقصد کو اہلِ یورپ نے مختلف اوقات اور مختلف حالات میں مختلف طریقوں سے حل کیا۔ آغاز میں تو انھوں نے یہی غنیمت سمجھا کہ مشرقی ممالک میں انہیں چند تجارتی سہولتیں حاصل ہو جائیں مگر ان کاروباری تعلقات میں جب ان پر مشرقی ممالک کی کمزوریاں آشکار ہوئیں اور انہیں اس امر کا اندازہ ہو گیا کہ یہاں سیاسی غلبہ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ تو انہوں نے فوج کشی کر کے ان ممالک پر بالجبر تسلط قائم کر دیا۔ مگر اس تسلط میں بھی ان کے پیشِ نظر ہمیشہ یہی بات رہی کہ ان ممالک کو خام مال کی خرید اور مصنوعات کی کھپت کے لیے منڈیوں کے طور پر استعمال کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے یہاں جو مدت حکمران کی حیثیت سے گزاری اس میں اجنبی بن کر رہے اور عام آبادی کے ساتھ گھل مل کر زندگی بسر کرنے سے عمداً گریز کیا۔ اس بات کا البتہ انھوں نے ضرور التزام کیا کہ مشرقی اقوام کا اپنی تہذیب، اپنے تمدن، اپنے مذہب، اپنی روایات پر سے اعتماد متزلزل ہو اور ان کے اندر مغربی تہذیب و ثقافت اور مغربی افکار و نظریات کے لیے عقیدت کے جذبات پیدا ہوں۔ وہ اپنی دنیا خود آباد نہ کر سکیں اور اگر کبھی مغرب کی سیاسی غلامی سے آزاد بھی ہوں تو ذہنی غلامی میں گرفتار رہنا پسند کریں۔

اہلِ مغرب نے سیاسی تفوّق کے قیام کے ساتھ ہی اس امر کو بھانپ لیا تھا کہ مشرق کا بیدار ہونا یقینی ہے اور اس بیداری کے بعد اسے مدتِ دراز تک سیاسی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر رکھنا امر محال ہو گا۔ چنانچہ اس نے اس کے

باشندوں کو ذہنی طور پر غلام بنانے کے لیے اپنا پورا زور صرف کیا۔ اسے ایک ایسا نظامِ تعلیم دیا جس سے انہیں اپنے معتقدات، اپنے افکار و نظریات پر اعتماد کو سخت دھکا لگا۔ لیکن وہ انہیں مغربی تہذیب کا پوری طرح پرستار نہ بنا سکے۔ اہلِ مغرب کی ان مذموم کارروائیوں کا سب سے زیادہ نقصان مسلمان قوم کو پہنچا اور ان کے ظلم و ستم کا ہدف زیادہ تر مسلمان ہی بنے۔

اسلام کے سوا مشرقی ممالک میں جتنی تہذیبیں اور جتنے فکری نظام تھے ان میں سے کوئی تہذیب اور فکری نظام ایسا نہ تھا جو مغربی افکار سے براہِ راست متصادم ہو۔ جس طرح اہلِ مغرب نے مذہب کو زندگی کا ایک گوشہ تصور کر کے حیاتِ اجتماعی کی عمارت خالص مادہ پرستی کی بنیاد پر اُستوار کر رکھی تھی بالکل اسی طرح مسلمانوں کے ماسوا مشرق کی دوسری قوموں نے مذہب کو زندگی کے اجتماعی معاملات سے بالکل بے دخل کر دیا تھا اور یہ فرض کر لیا تھا کہ مذہب کو سیاست، معیشت اور معاشرت سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہیے اور ان سارے معاملات کو دنیوی نظریات و قواعد کے مطابق طے کرنا چاہیے۔

یہ اندازِ فکر اور یہ طرزِ عمل مسلمانوں کے ضمیر سے مغایرت رکھتا ہے۔ اس امر میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کے اندر اسلام کے ساتھ سچی اور گہری وابستگی انگریز کے اس برِصغیر میں آنے سے پہلے ہی بڑی حد تک ختم ہو چکی تھی ورنہ اسے یہاں قدم جمانے اور مسلمان ممالک کو تاخت و تاراج کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ دنیا پرستی نے اس قوم کے بڑے حصے کو خدا پرستی سے غافل کر دیا تھا۔ مگر اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمان اسلام سے اس عملی بے تعلقی کے باوجود اس حقیقت کے ہمیشہ معترف رہے کہ ان کی ذلت اور رسوائی کا سبب صرف یہی ہے کہ انہوں نے اللہ کے دین کو چھوڑ دیا ہے۔ دنیا کی دوسری قوموں نے تو ترکِ مذہب کو فلاح کا ذریعہ سمجھا لیکن مسلمانوں نے اسے ہمیشہ اپنی تباہی و بربادی کا واحد سبب خیال کیا۔ یہ چبھتا ہوا احساس ان کے اندر ہمیشہ موجود رہا کہ ان کی زندگی کا نقشہ اللہ اور اُس کے رسول کی دی ہوئی تعلیمات سے مختلف ہے اور یہی ان کی پستی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ لہٰذا اگر وہ دنیا میں اقبال مند ہونے اور عزت و آبرو کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے آرزومند ہیں تو انہیں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اسلام کے مطابق ڈھالنا چاہیے۔ مسلمانوں کے اندر یہی احساس مختلف تحریکات کی صورت میں وقتاً فوقتاً نمودار ہوتا رہا۔ شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کی علمی کوششیں، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور

تحریک دیوبند، ندوہ اور اسی نوعیت کے دینی مدارس کا قیام، تحریک خلافت، تحریک پاکستان، سب اسی احساس کے مختلف مظاہر ہیں اور یہ عجیب بات ہے کہ مغربی تہذیب جس قوت کے ساتھ مسلمانوں کے اندر سرایت کرنے کی کوشش کرتی رہی اسی شدت کے ساتھ تصادم ہوتا رہا۔ سطح بیں اہل مغرب اس آویزش کو مسلم قوم کی ہٹ دھرمی اور تعصب پر محمول کرتے ہیں۔ چنانچہ اس موضوع پر جتنی کتب بھی منظر عام پر آئی ہیں ان کے مطالعہ سے یہی پتہ چلتا ہے کہ ان کی نظر میں یہ قوم اپنی دشمن ہے اور اسے اپنی بھلائی اور برائی کی کوئی تمیز نہیں۔ ان میں سے کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں جس میں اس امر کا صحیح طور پر جائزہ لیا گیا ہو کہ جب ساری قومیں مغربی تہذیب ہی میں اپنی فلاح ڈھونڈ رہی ہیں تو آخر مسلمان قوم کیوں اس سے بار بار متصادم ہوتی اور اس کا راستہ روکتی ہے۔ اس حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے مسلمانوں اور دوسری اقوام کے تعلقات میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ یوں تو اہلِ مغرب کی اس ناسمجھی کے کئی اسباب ہیں مگر ان میں دو بڑے نمایاں ہیں:

(۱) صنعتی انقلاب کے بطن سے الحاد کی جو تحریک نمودار ہوئی (اور جسے جنم دینے میں اس وقت کے مذہبی حلقے کا بڑا دخل تھا) اُس کا واسطہ ایک ایسے مذہب سے پڑا جس نے صدیوں پیشتر ایک نظامِ حیات کی حیثیت سے نہیں بلکہ زندگی کے ضمیمے کی حیثیت سے زندہ رہنا گوارا کر لیا تھا اور اپنے اس موقف کو اپنا مقدر سمجھ رکھا تھا۔ اس وجہ سے الحاد کی تنگ نظریا دریوں اور ان کے خود ساختہ نظریات سے تو پنجہ آزمائی ضرور ہوئی مگر مذہب سے اس کا تصادم نہ ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام اس کشمکش کو غیر متعلق تماشائی کی حیثیت سے دیکھتے رہے۔ تاریخ کے اسی تجربے کو سامنے رکھ کر الحاد نے اسلام کے خلاف جنگ جیتنے کی کوشش کی اور یہاں بھی دینی رہنماؤں کو اپنے ظلم و استبداد کا نشانہ بنایا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اسلام اور کفر کی اس کشمکش میں صرف علماء ان کے مدِّمقابل بن کر آئیں گے مگر عام مسلم آبادی اس سے بے تعلق رہے گی اور وہ چند سو یا چند ہزار "ملاؤں" کو رسوا اور بدنام کر کے یا ان پر مظالم ڈھا کر مغربی الحاد کو امتِ مُسلمہ پر مسلّط کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

گذشتہ دو سو سال کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اہلِ مغرب نے اسلام کے مزاج اور مسلمانوں کے اس کے ساتھ تعلقِ خاطر کو سمجھنے میں سخت غلطی کی ہے۔ یہ دین چند ملاؤں کی اجارہ داری نہیں جنہیں مٹا دینے سے اسے مٹایا جا سکتا ہو بلکہ یہ امت کی عظیم اکثریت کی عقیدت اور محبت کا مرکز ہے اور اس کے قلب و دماغ میں

یہ خیال پوری طرح راسخ ہے کہ اس کی بگڑی اگر کسی صورت میں بن سکتی ہے تو اسلام کو ہی سچے دل سے اپنا کر بن سکتی ہے اس ایک صورت کے سوا اس کی فلاح و بقا کی کوئی دوسری صورت نہیں۔ امتِ مسلمہ کا اسلام پر اعتماد ابھی جوں کا توں قائم ہے۔ یہ فی الحقیقت اس کی بڑی بدنصیبی ہے کہ کسی مسلمان ملک میں بھی سنجیدگی اور اخلاص سے یہ کوشش نہیں کی گئی کہ اجتماعی معاملات کو طے کرنے کے لیے رشد و ہدایت کے اس واحد سرچشمے کی طرف دل و جان سے رجوع کیا جائے۔ اسلام کا نام تو بلاشبہ وقتاً فوقتاً استعمال ہوتا رہتا ہے۔ اس مقدس نام پر لوگوں کو دھوکے بھی دیئے جاتے ہیں مگر اسے خلوص نیت کے ساتھ اپنانے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عوام کے دل میں اگر نفرت و حقارت کے جذبات پائے جاتے ہیں تو وہ اسلام کے خلاف نہیں بلکہ ان لوگوں کے خلاف ہیں جو اس مقدس نام سے ناجائز فوائد حاصل کرتے ہیں۔ اس کی تقدیس ان کے دلوں میں پوری طرح موجود ہے اور وہ اُسے ایک خاص مذہبی طبقے کی میراث نہیں سمجھتے بلکہ اپنی زندگی کی سب سے قیمتی متاع سمجھتے ہیں۔ اس بنا پر جب اس پر کوئی آنچ آتی نظر آتی ہے تو وہ اس المیہ کو خاموش تماشائی کی حیثیت سے نہیں دیکھتے بلکہ آگے بڑھ کر دشمن کی یلغار کو روکتے ہیں

(۲) اہلِ مغرب نے اس معاملے میں جس دوسری اہم حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ الحاد اور مسیحیت کی پہلی جنگ سیاست، معیشت اور معاشرت کے میدانوں میں نہیں لڑی گئی بلکہ تخیلات اور ما بعد الطبیعیات کے دُور دراز گوشوں میں لڑی گئی تھی۔ اہلِ مذہب نے مسیحیت کے نام پر کائنات کے بارے میں عجیب وغریب نظریات گھڑ رکھے تھے جن میں سائنسی انکشافات کے مقابلے میں آنے کی قوت نہ تھی مگر ہر شخص میں نہ تو اتنا علم تھا اور نہ شعور کہ وہ صحیح اور غلط کے درمیان فیصلہ کر سکتا اور یہ دیکھ سکتا کہ علمی تحقیقات کے سامنے توہمات زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتے۔ اس کے مقابلے میں آج اسلام اور الحاد کے درمیان جنگ ان میدانوں میں لڑی جا رہی ہے جن میں انسانوں کو کوئی فریب نہیں دیا جا سکتا۔ حقائق کا حقائق سے مقابلہ ہے، شواہد کی شواہد سے ٹکر ہے اور زندگی کے ٹھوس مسائل میدانِ عمل میں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔ میں اپنی اس بات کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔

مغربی منکرین اور سائنس دانوں اور مسیحی پادریوں کے مابین جو آویزش ہوئی اس کا محور زمین کی حرکت، چاند کی گردش، کائنات کا آغاز و انجام یا اسی نوعیت کے دوسرے طبیعیاتی مسائل تھے۔ اس آویزش نے بعض اوقات

تشدد کی صورت بھی اختیار کی جس کے نتیجے میں نہایت قیمتی جانیں بھی تلف ہوئیں مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ مسائل خواہ کتنی ہی بنیادی اہمیت کے حامل ہوں اور ان پر تحقیق نتائج کے اعتبار سے خواہ کتنی ہی دُور رس ہو، مگر ایک عام آدمی کے لیے یہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے اور وہ بیچارا نہ تو اتنا علم رکھتا ہے اور نہ ایسے سائنسی آلات رکھتا ہے جو اُسے کسی حتمی نتیجہ پر پہنچنے میں مدد دیں۔ اس کے نزدیک ان کی حیثیت سنی سنائی باتوں کی سی ہے۔ جس دلیل پر دل کو اطمینان ہو گیا اُسے قبول کر لیا اور جس سائنس دان کے علم پر بھروسہ کر لیا اس کی تصریحات کو صحیح مان لیا۔ ان مسائل کے بارے میں عام لوگوں کے نظریات یا میلانات کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

مگر اسلام اور الحاد کی کشمکش بالکل واضح ہے۔ اس کے مختلف محاذوں کو بھی لوگ اچھی طرح جانتے ہیں۔ جس گولہ بارود سے یہ لڑائی لڑی جا رہی ہے اس کے عناصر ترکیبی کو بھی ہر شخص بخوبی سمجھتا ہے، پھر جن مسائل میں تصادم ہو رہا ہے وہ بھی سب لوگوں پر پوری طرح آشکارا ہیں اور ہر فرد ان کی نوعیت کو اچھی طرح جانتا ہے اور پہچانتا ہے۔ مثلاً کون اس حقیقت سے آج ناواقف ہے کہ جس ملک میں سرمایہ داری آتی ہے وہاں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوتا ہے، وہاں ملکی دولت کا بیشتر حصہ ایک محدود طبقے کے اندر سمٹ کر رہ جاتا ہے، وہاں لوگوں کے اندر ہوس زر پیدا ہوتی ہے اور بے کسوں پر عرصہ حیات تنگ ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جب اشتراکیت آتی ہے تو سنگین قسم کی آمریت کا تسلط قائم ہوتا ہے اور انسانوں کو بے جان آلات کی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے منحوس سائے میں لطیف احساسات کی پنکھڑیاں مرجھا جاتی ہیں اور اخلاق اور روحانیت کی مٹی پلید ہوتی ہے۔

یہ وہ حقائق ہیں جو سورج سے زیادہ روشن ہیں۔ انہیں جاننے کے لیے کسی گہرے علم، کسی وسیع تجربہ گاہ اور کسی بیش قیمت سائنسی سامان کی ضرورت نہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جو جنگ ان کھلے میدانوں میں لڑی جا رہی ہو اس کے بارے میں عام آبادی کو کسی قسم کے دھوکے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ تلخ اور افسوسناک حقیقت آخر عوام کی نظروں سے کس طرح مستور رہ سکتی ہے کہ جن جن ممالک کی طرف سرمایہ داری اور اشتراکیت نے رُخ کیا وہاں دنیا پرستی کا دَور دورہ ہوا اور خدا سے بغاوت اور مذہب سے انحراف کی راہ ہموار ہوئی اور انسان نے مادی دنیا اور اس کی لذات ہی کو اپنی زندگی کا مقصود و مطلوب قرار دیا۔

ان حقائق کے کھل کر سامنے آجانے کے بعد اگر مسلم قوم کو اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار

دے دیا جائے تو وہ سرمایہ داری اور اشتراکیت۔ دونوں لعنتوں میں سے کسی لعنت کو بھی قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوگی اہل مغرب نے ایک طویل تجربے کے بعد اس حقیقت کو کسی حد تک سمجھ لیا ہے اس لیے انہوں نے اب مسلمانوں کو مغربی تہذیب کا پرستار بنانے کے لیے یہ طریق کار اختیار کر رکھا ہے کہ سرمایہ داری نے مسلم ممالک میں جس افلاس کو جنم دیا ہے، اس سے فائدہ اٹھایا جائے اور عوامی جذبات کو مشتعل کر کے مسلم قوم کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی جائے کہ اس کی غربت اور فاقہ مستی کا اگر کوئی کارگر علاج ہے تو صرف یہ ہے کہ وہ اشتراکیت کی راہ اختیار کرے۔

ممکن ہے بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت تو ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ان کی آپس میں سر پھٹول بھی ہوتی رہتی ہے۔ پھر سرمایہ داری مسلم ممالک میں اشتراکیت کی کیونکر ہمنوائی کر سکتی ہے۔ مگر یہ حالات کا بالکل سطحی مطالعہ ہے۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کی اساس مادیت ہے۔ اس بنا پر اصل کے اعتبار سے وہ دونوں ایک ہیں۔ ان کے درمیان جو کچھ فرق ہے وہ محض طریق کار کا ہے۔ سرمایہ داری نظام میں مادیت کی یلغار پیدائش دولت سے شروع ہوتی ہے اور پھر وہ مذہب و اخلاق کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہے اور ملک کے سارے وسائل کو براہِ راست اپنی تحویل میں لینے کے بعد مذہب، اخلاق اور معاشرت پر حملہ آور ہوتی اور اس پر اپنا تسلّط قائم کرتی ہے۔

اشتراکیت کی ٹیکنیک زیادہ مؤثر اور انقلاب انگیز ہے کیونکہ اقتدار پر بالجبر قبضہ کرنے کی وجہ سے کسی قوم کی پوری دولت، اس کے سارے وسائل اور ملک کی پوری انتظامی مشینری، الغرض اس کی پوری قوت اس کے ہاتھ میں سمٹ آتی ہے اور پھر کوئی ادارہ یا گروہ اس کی غیر معمولی طاقت کی تاب نہیں لا سکتا۔ چنانچہ مسلمان قوم کو مغربی تہذیب میں رنگنے اور اسے معاشرتی، معاشی اور فکری اعتبار سے مغرب کا غلام بنانے کے لیے اشتراکی انقلاب زیادہ موزوں اور مناسب ہے۔ اہلِ مغرب کے نزدیک یہ حربہ کس قدر مؤثر ہے اس پر کئی ایک کتب شائع ہوتی ہیں۔ ہم ذیل میں ایک کتاب "تجدد کا چیلنج"[1] کے بعض اقتباسات پیش کرتے ہیں جس سے یہ معلوم ہو گا کہ سرمایہ دارانہ ممالک مشرقی ممالک میں اشتراکیت کے فروغ کو کیوں ضروری سمجھتے ہیں اور اس کے تسلط

---

[1] THE CHALLENGE OF MODERNIZATION

BY I.R. SINAI

کے لیے آمریت کی کیوں تائید کرتے ہیں۔

"ظاہر بات ہے کہ جو انقلاب پسند طبقہ (معاشرے کی مغربی نظریات کے مطابق) تجدید کے لیے آگے بڑھے گا وہ اس کام کو آزاد جمہوری فضا کے اندر سرانجام نہ دے سکے گا۔ ان نظریات کے تسلط کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ معاشرتی اور معاشی قوت کا بیشتر حصہ حکومت کے قبضے میں ہو، تاکہ وہ رائے عامہ کے علی الرغم بہت سے ناپسندیدہ اقدام کر سکے اور لوگوں کی روایات اور ان کے دل پسند نظریات کو ہدفِ تنقید بنا سکے۔ معاشی ترقی کا خواب آزاد معیشت میں کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

جمہوریت ہر بیماری کا تریاق نہیں ہو سکتی اور نہ یہ ہر ملک کے لیے موزوں اور مناسب ہے۔ انسانی ارتقاء میں بعض ایسی منازل بھی آتی ہیں جن میں مطلق العنانیت ایک ناگزیر ضرورت محسوس ہوتی ہے تاکہ (اُس قوم کے دل و دماغ کو، صدیوں کی روایت کے ملبے سے صاف کیا جائے اور جاہل عوام پر ایسے تغیرات ٹھونسے جائیں جنہیں وہ خوشی سے قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوں۔ مشرقی قوموں کو مغربی تہذیب کا پرستار بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ تبدیلی سے پہلے غیر معاشی حالات میں تغیر لایا جائے۔ اس بنا پر ان سارے ممالک کی اولین ضرورت یہ ہے کہ یہاں ایک ایسی نئی قیادت کو اُبھارا جائے جو ان سارے تغیرات کے بوجھ کو اٹھانے اور ان کے خطرات کو مول لینے کے لیے تیار ہو اور اپنے دل کی گہرائیوں سے اس بات کا مستحکم ارادہ رکھتی ہو کہ اسے اپنے معاشرے کی روایات کو قوت کے ساتھ توڑنا ہے اور عوام کو اس غیر معمولی ایثار کے لیے آمادہ کرنا ہے جو اہلِ مغرب کو مختلف تغیرات میں سے گذرتے ہوئے کرنا پڑا۔

یہ نئی قیادت اپنے مزاج کے اعتبار سے بڑی سخت اور متشدد ہونی چاہیے اور اُسے اس حقیقت کا برملا اظہار کرنا چاہیے کہ وہ جمہوری طریقوں سے حکومت کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ اس کی سیاسی بصیرت میں صرف دو عزائم ہی کارفرما ہونے چاہییں۔

(۱) معاشرے کو زیر و زبر کرنے کا عزم۔ (۲) اور معاشرے کو ایک آہنی نظم و ضبط میں جکڑنے کا ارادہ۔

اس نئی قیادت کو یہ بات پوری طرح ذہن میں رکھنی چاہیے کہ روایتی اداروں اور روایتی افکار کے اندر تبدیلی آہستہ آہستہ نہیں بلکہ یک لخت ہی لائی جاتی ہے۔ کسی معاشرے کے مختلف شعبوں میں پیوندکاری یا اس کے کسی ایک گوشے یا دوسرے گوشے میں تبدیلی نئی پیچیدگیاں پیدا کرتی ہے اس بنا پر نئی اور بامقصد قیادت کو ایک وار میں زندگی کا پورا ڈھانچہ بدل دینا چاہیے تاکہ اس کا ماضی سے آناً فاناً رشتہ منقطع ہو جائے اور اس کے اندر نئی متوازن عادات اُبھر سکیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ یہ نئی قیادت ایک ایسی آمرانہ ریاست کی تشکیل کرے جو مروّجہ نظام کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکے اور ایک ہی دھکے کے ساتھ لوگوں کو اپنی روایات کی دلدل سے نکال دے اور ان کے قدیم معتقدات اور مذہبی اعمال پر پوری شدّت سے حملہ آور ہو۔ نیز اس قیادت کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ فرد کے حقوق کو نظر انداز کرے، معاشرے میں جن اداروں، گروہوں کو کسی قسم کے تحفظات حاصل ہیں انہیں ان سے محروم کرے اور کسی جماعت یا مفاد کو تجدد کی راہ میں حائل نہ ہونے دے۔

یہ نئی قیادت جس گروہ کو معرضِ وجود میں لائے گی وہ بڑا سخت جان، بڑا منظم اور تنظیمی صلاحیتوں سے پوری طرح بہرہ مند ہوگا۔ اس میں بلاشبہ کچھ خامیاں بھی ہوں گی مگر اس میں اتنی قوت اور خود اعتمادی ضرور ہوگی کہ وہ تجدید کی راہ کی ان ساری رکاوٹوں کو دُور کر سکے جنہیں بعض معاشرتی روایات نے جنم دیا ہے۔

اس نئی قیادت کو سب سے پہلے سست رفتار معاشرتی قوتوں سے نبرد آزما ہونا ہے اور مغرب میں نشاۃ ثانیہ اور تحریک احیاء العلوم نے جس روح کو جنم دیا ہے اُسے اچھی طرح اپنا کر آگے بڑھنا ہے۔ مغربی اقدار، مغربی احساسات، مغربی محاسن اور مغربی نقطۂ نظر سے قائدانہ صلاحیت کو اپنائے بغیر کوئی ترقی ممکن نہیں۔ اور جب تک مشرقی معاشرے اپنے آپ کو مغرب کی ساری صفات سے اچھی طرح متصف نہیں کر لیتے، ان میں جدید مسائل کو کامیابی کے ساتھ حل کرنے کی اہلیت پیدا نہیں ہو سکتی۔

اس منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے ایک ایسا نیا نصب العین درکار ہے جو نہ صرف

معاشرتی اقدار کے قدیم پیمانوں کو پوری قوت کے ساتھ تبدیل کر دے بلکہ نئے نظامِ اخلاق کی بھی صورت گری کرے۔

یہ نصب العین ایک ایسا تیزاب ہو جس میں مروّجہ معاشرتی روابط خود بخود تحلیل ہو کر رہ جائیں۔

اس انقلاب انگیز نصب العین کی کئی شکلیں اور صورتیں ممکن ہیں مگر اس کا مقصد بہر طور یہ ہونا چاہیے کہ وہ مذہب اور اس کی روایات کی بے ہنگم قوتوں کو پامال کرے اور توڑے اور ایک ایسا نیا مضبوط انسان پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو جو اپنے آپ کو پوری طرح تبدیل کرے اور معاشرے کو بھی مکمل طور پر بدل ڈالے۔ جب تک اس نئے نصب العین میں لوگوں کی زندگیوں میں بالجبر انقلاب لانے اور پرانی روایات کو توڑنے کی قوت پیدا نہیں ہوتی۔ ایسی روایات جنہوں نے ذہنوں کو زنگ آلود کر کے عوام کی صلاحیتوں کو بیکار بنا دیا ہے۔ اس وقت تک وہ صحیح معنوں میں حریت اور آزادی کے حصول کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔"

مسٹر سمتھ نے اپنی کتاب میں مشرق کو مغربی تہذیب کا پرستار بنانے کے لیے جو نسخہ پیش کیا ہے اس کے اجزاء کا بار بار مطالعہ کیجیے اور دیکھیے کہ کس چالاکی اور ہوشیاری کے ساتھ بربادی کا یہ مرکب تیار کیا گیا ہے اور اگر مشرق کی کوئی ہوشمند قوم اس کی ہولناکیوں کا احساس کرتے ہوئے اس زہر کو پینے سے انکار کر دے۔ تو اسے زبردستی پلانے کے لیے کس تشدد کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ یہ سارا پروگرام اس مفروضے پر طے کیا گیا ہے کہ مشرق کی ساری اقوام فکر و نظر کے اعتبار سے تہی دامن ہیں۔ وہ اپنے پاس کوئی ایسا انقلابی نصب العین اور ضابطہ نہیں رکھتیں جن کے بل پر وہ دنیا میں عزت و آبرو کی زندگی بسر کر سکیں۔ انہیں اگر دنیا میں خوشحالی کی زندگی بسر کرنا ہے تو اس کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ مغربی تہذیب و تمدن کو پوری طرح اپنانے کی کوشش کریں۔ مگر یہ ہمہ گیر انقلاب کسی مشرقی قوم کو آزادی کی فضا مہیا کر کے جمہوری طریقے سے لایا نہیں جا سکتا، کیونکہ ان اقوام کا مذہب اور اس کی روایات اس انقلاب کی راہ میں حائل ہو جاتی ہیں۔ ان رکاوٹوں کو دور کرنے اور مشرقی قوموں کو بالجبر مغربی تمدن میں رنگنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انہیں کسی ایسے انقلاب انگیز نصب العین کو اپنانے پر مجبور کر دیا جائے جس سے ان کے فکر و نگاہ کے زاویے اور جذبہ و احساس کے ڈھانچے دفعتاً تبدیل ہو جائیں،

اور وہ خود اپنی مذہبی روایات توڑ کر اور اخلاقی ضابطوں سے بغاوت کر کے مغربی افکار و نظریات اور مغربی تمدن کی علمبردار بن جائیں۔

کسی قوم کو اس کی روایات سے بیگانہ بنانا کوئی ایسا آسان کام نہیں جس کے لیے وہ خوشدلی سے تیار ہو جاتے۔ اس بنا پر مسٹر سینیاتے نے کھل کر یہ کہا ہے کہ یہ کام آمریت، تشدد کی مدد سے ہی بخوبی سرانجام دے سکتی ہے۔ چنانچہ اس نئی قیادت کی کامیاب جدوجہد کے لیے تین چیزیں از بس ضروری خیال کی ہیں۔

(۱) ایک ایسا خیال انگیز نصب العین اور معاشرت، سیاست اور معیشت کا ایسا ہمہ گیر نظام جو سیلاب بن کر اُمڈ پڑے اور مذہب اور مذہبی روایات کو پوری قوت کے ساتھ اپنے ساتھ بہا لے جائے اور مغربی تہذیب کی نشوونما کے لیے حیرت انگیز سرعت کے ساتھ زمین ہموار کر دے۔

(۲) اس نئی قیادت کا مزاج سراسر آمرانہ ہو اور وہ قوم پر نہایت سخت قسم کی آمریت مسلط کرے اور اپنے انقلاب انگیز عزائم کی تکمیل میں رائے عامہ کو قطعاً درخور اعتناء نہ سمجھے بلکہ اگر کسی گوشے سے بھی اختلاف کی معمولی آواز بھی بلند ہو تو اُسے سختی سے دبا دے۔

(۳) یہ قیادت انقلاب کے لیے تشدد پر کامل ایمان رکھتی ہو اور قوم سے ہر بات جبر کے ساتھ منوانے کے لیے تیار ہو۔ جو لوگ اس کے انقلابی پروگرام کا ساتھ دینے میں ذرا سست رفتاری کا ثبوت دیں انہیں بلا تامل نیست و نابود کر دے۔

مسٹر سینیاتے کے تجزیے کے مطابق یہ کام صرف اشتراکیت کے ہاتھوں ہی بڑی خوبی کے ساتھ سرانجام پا سکتا ہے اور صرف کامریڈوں کے جتھے انقلابی قیادت کی ضرورت کو پورا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ فاضل مصنف کے قول کے مطابق اشتراکیت ایک ایسا انقلاب انگیز نصب العین ہے جو طوفان بن کر اُٹھتا ہے اور مذہب اور اس کی روایات کو چشم زدن میں تاراج کر کے رکھ دیتا ہے۔ دوسرے اشتراکیت آمریت کی راہ اختیار کرنے کی وجہ سے بڑی مُنہ زور ہوتی ہے اور اس کی بے حس جکڑ بندیاں اشتراکیت کے علمبرداروں کو دین اور اخلاق برباد کرنے کی کھلی چھٹی مہیا کرتی ہیں اور انہیں اس بات کے مواقع فراہم کرتی ہیں کہ وہ اُن لوگوں کو جو اس کی راہ میں مزاحم ہوں اذیت ناک عذاب دے کر موت کے گھاٹ اتار دے۔ مادیت، آمریت اور تشدد

یہ وہ تثلیث ہے جس پر ہر اشتراکی پورا پورا ایمان رکھتا ہے اور ان تینوں میں سے کسی ایک کا انکار اشتراکی شریعت میں ناقابلِ معافی جرم ہے۔

اس ضمن میں سینائے صاحب کا استدلال ملاحظہ فرمائیں:

"دورِ جدید میں اشتمالیت بیسویں صدی کے سرمایہ دارانہ انقلاب کا نہایت اچھا نعم البدل ہے جو بدقسمتی سے روایت پرست معاشروں میں کامیابی کے ساتھ برپا نہ کیا جا سکا۔ یہ نظام بلاشبہ تشدد وانہ اور کلیت پسندانہ ہے مگر پس ماندہ معاشروں کو صنعتی اور جدید بنانے اور معاشی، تعلیمی اور سائنسی میدانوں میں انہیں مغرب زدہ بنانے کے لیے یہ نہایت ہی کارگر ہتھیار رہا ہے اور پھر چونکہ اس میں کسی معاشرت کی گہری روایات کے انکار کا بھی حوصلہ ہوتا ہے اس لیے کسی نئے صنعتی معاشرے کی تعمیر و ترقی کے لیے اس سے بے پناہ قوت مہیا ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ یہ نظام اپنی وحشیانہ طاقت کے بل بوتے پر پوری قوم کو کام پر لگا سکتا اور معاشرے کو زیر و زبر کر سکتا ہے اور وحشیانہ بے حسی کے ساتھ ہر جماعت اور طبقے کے دعوے کو نظر انداز کر سکتا ہے جو اس کی راہ میں حائل ہو۔ پھر اس نظام کو برپا کرنے میں لوگوں پر جو مصائب آئیں یا وہ جن شدائد سے دوچار ہوں سوشلزم ان کے بارے میں آنکھیں بند کر کے آگے بڑھنے کی تلقین کرتا ہے۔

"اشتمالیت نے خود آگے بڑھ کر ایک ایسی "مملکتی سرمایہ داری" یا نوکر شاہی کو جنم دیا ہے جو کسی صنعتی معیشت کا نقشہ تیار کرنے، اسے کامیابی کے ساتھ چلانے اور اس کا بہتر طور پر انتظام و انصرام کرنے کے لیے انسانوں کے اندر مغربی صفات اور خوبیاں پیدا کرتی ہے۔" مملکتی سرمایہ داری کی تشکیل اشتمالیت کا سب سے بڑا کارنامہ ہے"

مسلمانوں، بالخصوص پاکستانی مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ سینائے صاحب کی ان تصریحات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور دیکھیں کہ کیا سرمایہ داری اور اشتراکیت میں اصل کے اعتبار سے کچھ بھی فرق ہے اور کیا اشتراکیت کا مقصد مغرب کی اسی مادی تہذیب کو فروغ دینا نہیں ہے جسے سرمایہ داری اپنے جلو میں لے کر آگے بڑھی ہے؟ ان کے مابین اگر کچھ فرق ہے تو یہی کہ جس نحوست کو سرمایہ داری آہستہ آہستہ لاتی ہے اسے اشتراکیت یکبارگی قوت کے